اس شمارے میں

حرفِ اوّل

آمد بہار کی ہے.....!	حافظ خالد محمود خضر	2

مطالعہ قرآن حکیم

جہاد بالقرآن (۲)	ڈاکٹر اسرار احمد	3

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	32

نباتاتِ قرآن

فُوم (لہسن)	سید قاسم محمود	41

فکر و نظر

مصاحفِ عثمانیہ: ایک تاریخی اور ارتقائی جائزہ	حافظ محمد زبیر	44

اسلام اور سائنس

کائناتی سائنس اور قرآن	سہیل زاہد	57

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

حکمت قرآن

ماہنامہ — لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

حافظ عاطف وحید

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۴ — رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ - اکتوبر ۲۰۰۵ء — شمارہ ۱۰

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۵۴۷۰۰ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرتعاون 100/- روپے فی شمارہ 10/- روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700/- روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900/- روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آمد بہار کی ہے.....

نیکیوں کے موسم بہار یعنی رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ ایک حدیثِ نبویؐ کے الفاظ کی رو سے ایک عظمت والا اور بابرکت مہینہ ہم پر سایہ فگن ہو رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے رمضان کو ''اللہ تعالیٰ کا مہینہ'' قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یوں تو سارے ہی مہینے اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں' لیکن رمضان المبارک کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ رمضان المبارک کی یہ خصوصی وجہ امتیاز اس کے نزول قرآن کا مہینہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۵ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان وارد ہوا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا''۔ اسی ماہِ مبارک میں وہ عظمت والی رات بھی ہے جسے قرآن حکیم میں ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا گیا ہے اور اس رات کی اس قدر فضیلت کا باعث بھی یہی ہے کہ یہ نزولِ قرآن کی رات ہے ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾۔

نزولِ قرآن کا مہینہ ہونے کی نسبت سے رمضان المبارک قرآن حکیم سے تجدیدِ تعلق کا مہینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں اہلِ ایمان کو جو دوگونہ پروگرام عطا کیا گیا ہے اس میں قرآن حکیم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی دن روزے کے ساتھ بسر کرنا اور رات کے لمحات میں قرآن حکیم پڑھنے یا سننے کے لیے قیام کرنا۔ اس دوگونہ پروگرام کے دونوں عناصر ''روزہ اور قرآن'' انسان کے مرکب وجود یعنی جسد اور روح کے تقاضوں میں تطبیق اور توازن پیدا کرتے ہیں۔ روزے کی حالت میں جسمانی تقاضوں یعنی بھوک اور شہوت پر پابندی عائد کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں روح پر جسد کی گرفت کمزور پڑتی ہے اور گویا روح کو سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔ پھر رات کے وقت قرآن حکیم کی تلاوت یا سماعت کے ذریعے روح پر انوارِ قرآنی کی بارش ہوتی ہے جس سے روح میں بالیدگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح دن کا روزہ اور رات کا قیام دونوں مل کر ایک عظیم مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس رمضان المبارک کو ہمارے لیے باعثِ خیر و برکت بنائے اور ہمیں اس کے شب و روز سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ ○○

18

جہاد بالقرآن

صدر مؤسس مرکزی انجمن محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
کا ایک جامع خطاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

اقامت دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آیئے ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم و لابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے' اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات' چودھراہٹیں' سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یافتہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے' جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں' جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہو گیا ہے' وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے' اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے کہ ع

''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے''

ہوش میں آؤ' اپنی قوتوں کو مجتمع کرو' یہ ایک آندھی آ رہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید

ہے۔قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳'الفتح:۲۸'الصف:۹)

اوران میں سے دو مقامات پر آیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔یعنی یہ ایک اٹل قانون ہے کہ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کرسکیں گے۔تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہو گا اور بالفعل (Physical) تصادم ہوگا۔اب طاقت' طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔اس کے پہلے مرحلہ کو ہمکہیں گے ''صبر محض'' کہ ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکّہ میں یہی حکم رہا کہ اگر تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جا رہا ہے تو لیٹ جاؤ' مگر جوابی کارروائی نہیں کرسکتے۔اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance ــــ یعنی کلمۂ توحید اور کلمۂ طیبہ پر قائم رہو' لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہوگئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو للکارو اور چیلنج کرو۔اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو۔اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے Armed Conflict یا مسلح تصادم' یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اور اذنِ قتال دے دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴾ (الحج)

''(آج سے) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مکی دور صبرِ محض کا دور تھا۔مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے

اقدام فرمایا اور چھاپے مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو' جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے' مخدوش بنا دیا۔ گویا قریش کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا' کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔

صبر محض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ''مسلح تصادم'' کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے' وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی' برداشت کر رہی تھی' لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ''قتال فی سبیل اللہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکمِ الٰہی آتا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ (البقرۃ)

''(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے' اور وہ تمہیں ناپسند ہے' اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو درانحالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو درانحالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آ گئی

ہے' تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ وفساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے' اس کی ہمارے اکثر اصحابِ علم مختلف تشریحات وتوجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے' استحصال بھی فتنہ ہے' ناانصافی بھی فتنہ ہے' لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اِس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اگر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظامِ حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرۃ:۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرۃ:۲۱۷) غور کیجئے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ' اپنے ہی بھائی بند' اپنے ہی اعزّہ و اقارب مدمقابل تھے' لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ (الزمر:۳) اور: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ:۱۳) سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ ''اور چاہے مشرکوں کو یہ

کتنا ہی ناگوار ہو!''

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت و سیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل وقسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دین اللہ کے قیام ونفاذ کو روکنے کے لیے صرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تاکہ ''حق بحق دار رسید'' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾ (الاحزاب)

''اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا

حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمۂ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹریبونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا' برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں' اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہوسکتا ہے' وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہوسکتا!

ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں

بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (۹) درجے بن جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امیدِ موہوم ہے۔ ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ ''یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں''۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو

اُس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرطِ لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

''مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقینِ قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں' ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

اللہ کی محبت' اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا

حال ہے۔ فرمایا کہ اے نبی ﷺ! ان مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ یعنی اپنے باپوں کی محبت' اپنے بیٹوں کی محبت' اپنے بھائیوں کی محبت' اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزہ و اقارب کی محبت۔ ماں' بیٹی' بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائقِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے' ساتویں اس کاروبار کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے' جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے' جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے' کہیں گھاٹا نہ ہو جائے' اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں' جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت' دوسری اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا' کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق و سامانِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر فَتَرَبَّصُوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ''جاؤ دفع ہو جاؤ'' ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابل توجہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظن غالب ہے کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا ؎

یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس

بات پر دلالت کرتی ہے' بلکہ میرے غور وفکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب وتشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرا یقین قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمۂ شہادت' اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' حج اور صومِ رمضان' پانچ ارکانِ اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں' لہٰذا میں فرائض دینی کے جامع تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور وفکر کیا ہے' نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ''تواصی بالحق'' قرار دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۟﴾

''ال ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں' پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔''

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح وتشریح اور تفصیل ہے۔

جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقامِ محبوبیت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۟﴾ (الصف) ''یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔''

اور سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ))

اور:

((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ))

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله۔

''اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زور آور اور زبردست ہے۔''

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالمِ ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے' البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفع آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے' کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے' اس پر صرف معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ﴾ بنی اسرائیل نے آنجنابؑ کا انکار کیا لیکن انہیں عذابِ استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیحؑ قربِ قیامت میں جناب محمد ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا' موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے لحاظ سے حسبِ ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرضِ عین نہیں فرضِ کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ''جہاد'' وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں' جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے

محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ''قتال'' اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ))(۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی''۔ بقول اقبال۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی

جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے' عافیت اسی میں ہے' ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی زبان ہوتی ہے' ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے ___ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب وسنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ''جہاد''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغزولم یحدث نفسہ بالغزو۔

کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ''انقلاب''۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (Levels) بیان کی ہیں' انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation 'اس کی نشر و اشاعت' اس کو پھیلانا' اس کو عام کرنا' اسے ذہنوں میں اتارنا' اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا' اس انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہوگئی ہے۔

انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظم کیا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہوسکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۂ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ:

﴿رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۚ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ﴾

''اے میرے ربّ! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا' مگر میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں بآوازِ بلند دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے

چپکے بھی سمجھایا۔''

لیکن قوم مُردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا' بلکہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۂ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' یہاں ''قلیل'' وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے' یعنی بہت ہی کم' معدودے چند۔ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی' وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں' بہرحال ساتھی نہ ملے' جمعیت فراہم نہیں ہوئی' لہٰذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے' وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہوگا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے' حق کو قبول کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا' ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا' لہٰذا وہ بریُ الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت و تزکیہ' تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں' یعنی دین کا غلبہ' دین کا قیام' دین کا نفاذ' دین کی سربلندی' تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں

ہوسکتا' چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں' ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں' تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہٰذا اقامت دین اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے' اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیض ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے' ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد ﷺ۔ درمیان میں تین رسول ہیں' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے' اوّل و آخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی' لیکن کوئی اعوان و انصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوۂ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں' کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد میں مابہ الامتیاز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸' ۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ.....﴾

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں

وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں.....''

بقول شاعر مشرق۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

محمد رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم ﷺ کے اعوان و انصار بنے ہیں کہ ع ''ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم'' والا نقشہ ہے۔ جو غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو' کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ (المائدۃ)

''پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور دونوں جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

جہاں آپ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں' اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق و دق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو' اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو' اس میں سمع و طاعت کا وصف و جوہر نہ ہو' اس میں نظم و ضبط نہ ہو' وہ

تربیت یافتہ نہ ہو' اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو' اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے' لہٰذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا' دعوتِ حق کو قبول کیا' اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد و مصائب' فقر و فاقہ' کشمکش و تصادم' جہاد و قتال کے مراحل میں جاں نثاری' قربانی و ایثار' صبر و تحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور ﷺ کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہار دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا' بموجب ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾۔ چونکہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں لہٰذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجنابؑ کی بعثتیں بھی دو نوعیتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝﴾ (طٰہٰ) اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت و تبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت و تزکیہ میں ہمہ وقت و ہمہ تن لگے رہے' حتیٰ کہ فرعون کے اعراض' سرکشی' دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ

صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے' اور پشت پھیر کر پیچھے مت پلٹو' ورنہ ناکام و نامراد لوٹو گے۔''

لیکن قوم بزدل اور تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ' دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارضِ مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے' اب تمہاری ہمت درکار ہے' پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی' نافرمانی' بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

﴿رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''اے میرے ربّ! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی

اختیار نہیں' پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔''

قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ پاداش اپنا حکم سنا دیا:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۗ﴾ (المائدۃ)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارض مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے رہیں گے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظم ہو' اس میں سمع و طاعت کا جوہر نہ ہو' اس میں نظم و ضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))(۱)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزامِ جماعت کا' اور سننے اور ماننے کا' اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔''

ایک اور روایت میں ((آمُرُكُمْ بِخُمْسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ)) ''اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے''۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولِ سمع و طاعت پر مبنی ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں' اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ' نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

انقلابی دعوت و تربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو

(۱) مسند احمد ۱۳۰/٤۔ وسنن الترمذی' ابواب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

اکبرالہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کو اپنا مرشدِ معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا ہے: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطۂ عروج پر آتا ہے۔ ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

یہ تربیت ہے' یہ تزکیہ ہے' یہ تعلق باللہ ہے' یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو اور تمنا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے' جس کو باطل اور طاغوت سے جا ٹکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبر محض' اقدام اور مسلح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے' جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت و اہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے' اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت و تبلیغ ہو۔ یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اسی میں جدال بھی ہے۔ مشرکین' ملحدین' منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آ گئے ہیں: ﴿اُدْعُ اِلٰى

سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۂ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ''بِہٖ'' پر ہمارے اکثر اہلِ علم نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار و تبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ﴾

''کل حمد و ثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔''

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (ق) ''پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے''۔ معلوم ہوا کہ دعوت و تبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم و کشمکش کہہ لیں' اس کا ذریعہ' اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اِس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے۔

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہوتے ہیں لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرامؒ کی غیر مصدقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے' حالانکہ موعظۂ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے' لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ و نصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں ہیں' جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا' انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے' جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ قرآن مدعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ میں

ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں۔ مگر اِس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

''پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے''۔

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں' جو مدعی ہے ''شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسراءیل:۸۲)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے' در در سے بھیک مانگ لی' لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت و تزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کا معترف ہوں' لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور و ادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

''شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے''۔

غور کیجئے ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمو دیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (متفق علیہ)

''شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون''۔

پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیثِ نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے' وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی) انہوں نے سوال کیا کہ حضور ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!'' یہ ہے وہ بات جو دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔

اگر زہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے' اندر کی

تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب' یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے' ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ''جہاں دیگر شود'' کا اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آ گئی اس کے لیے جہاں بدل گیا' اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی' اس کا زاویہ نظر بدل گیا' اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے' بلکہ ''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالم پیر مر رہا ہے'' والا معاملہ ہے۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے فدائین کی ایک منظم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا' جبکہ آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں' یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو Levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلۂ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا' ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی' کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ''میثاق'' کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر' خود ہی مالک' خود ہی پروف ریڈر' حتیٰ کہ خود ہی

اس کا کلرک اور چپڑاسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا' وہی ''میثاق'' والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ ع ''ہے مشق سخن جاری' چکی کی مشقت بھی'' کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا' نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' اور اس کے زیر انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمدللہ بعض دردمند اور اہل دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہوگئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

الحمدللہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام' اس کے لیے دفاتر' رہائشی کوارٹرز' ہاسٹل' جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات' علوم و معارف قرآن کی نشر و اشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام' دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس و خطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش' قرآن کانفرنسوں اور محاضرات قرآنی کا انعقاد' مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام' ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار' میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے موثر ذریعۂ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ''الہدیٰ'' کے نام سے قرآن مجید کا

پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ''الکتاب'' کے عنوان سے ایک پروگرام ہو گا' اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں' میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجئے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو' انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا' وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعۂ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا' وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ''الکتاب'' کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا' پھر تیسرے سال رمضان ہی میں ''الٓمٓ'' سیریز چلی' پھر ''الہدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر بالکل درمیان میں ''الہدیٰ'' کا پروگرام ختم ہو گیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ

شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (البقرۃ)

''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے''۔

اس ''الہدیٰ'' کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہوگئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جارہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ''الہدیٰ'' کے پروگرام کو بنایا' ورنہ ہمیں کون جانتا تھا' اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقۂ تعارف پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آرہی ہے۔

بہرکیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقۂ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے' اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں' ایک قیام اللیل' دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت و قراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۚ﴾ (المزمّل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔ آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔''

بعد میں جب اس نے ایک معین شکل اختیار کی تو حکم آیا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراء یل:۷۹)

''اور رات کو اِس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو' یہ تمہارے لیے نفل ہے''۔

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں' بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت وتلاوت' یہ دو ہتھیار ہیں جن سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دعوتِ موعظہ اور مجادلہ میں تأثیر پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا' اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ' وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ' اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا' وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ الَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ○○

(مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے یہ خطاب مرکزی انجمن کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء میں ارشاد فرمایا تھا۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور قدرے حک واضافہ کے ساتھ مرتب کر کے میثاق میں شائع کیا۔ بعد ازاں یہ قابل قدر خطاب کتابچے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ اب مزید نظر ثانی اور تخریج احادیث کے ساتھ اس خطاب سے حکمتِ قرآن کے صفحات کو مزین کیا گیا ہے۔)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان
نظر ثانی: حافظ محمد زبیر

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۶۸

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾

ح ل ل

حَلَّ (نَ ض) حِلًّا اور حَلَالًا: رسی کھولنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں آتا ہے: (۱) گرہ کھولنا۔ (۲) کسی جگہ اترنا (منزل پر سواری سے اتر کر سامان کی رسیاں کھولتے ہیں)۔ (۳) احرام کھولنا (احرام کی پابندیاں یعنی بندشیں کھل جاتی ہیں)۔ (۴) جائز ہونا' حلال ہونا (استعمال کرنے کی بندش کھل جاتی ہے)۔ ﴿اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (طٰہٰ:۸۶) ''یا ارادہ کیا تم لوگوں نے کہ اُترے تم لوگوں پر کوئی غضب تمہارے ربّ کی جانب سے۔'' ﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ﴾ (المائدۃ:۲) ''اور جب تم لوگ احرام کھولو تو شکار کر لو۔'' ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ (البقرۃ:۲۲۸) ''اور جائز نہیں ہوتا ان خواتین کے لیے کہ وہ چھپائیں اس کو جو پیدا کیا اللہ نے ان کے رحموں میں۔''

اُحْلُلْ (فعل امر): تو کھول۔ ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴾ (طٰہٰ) ''اور تو کھول دے گرہ میری زبان سے۔''

مَحِلٌّ (اسم الظرف): اُترنے کی جگہ۔ ﴿لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (الحج) ''تم لوگوں کے لیے ہیں اس میں کچھ فائدے ایک مقررہ مدت تک' پھر اس کی منزل ہے قدیم گھر کی طرف۔''

حَلِيْلٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر): شوہر (بیوی کے لیے ہمیشہ حلال ہوتا ہے)۔

حَلِيْلَةٌ ج حَلَائِلُ (فَعِيْلٌ کی مؤنث فَعِيْلَةٌ کے وزن پر): بیوی (شوہر کے لیے ہمیشہ حلال ہوتی ہے)۔ ﴿وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (النساء:۲۳) ''اور بیویاں تمہارے اُن بیٹوں کی جو تمہاری صلب سے ہیں۔''

حِلٌّ (صفت بھی ہے): جائز' حلال۔ ﴿وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ (المائدۃ:۵) ''اور تم لوگوں کا کھانا حلال ہے ان لوگوں کے لیے۔''

حَلَالٌ (صفت بھی ہے): جائز' حلال۔ ﴿هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ﴾ (النحل:۱۱۶) ''یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔''

اَحَلَّ (افعال) اِحْلَالًا: کسی چیز کو جائز کرنا' حلال کرنا۔ ﴿لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (المائدۃ:۸۷) ''حرام مت کرو پاکیزہ چیزوں کو جن کو حلال کیا اللہ نے تمہارے لیے۔''

حَلَّلَ (تفعیل) تَحْلِيْلًا اور تَحِلَّةً: کفارہ ادا کرنا (کسی عہد یا قسم کی پابندی کھولنے کے لیے)۔ ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ج﴾ (التحریم:۲) ''فرض کیا ہے اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کا کفارہ ادا کرنے کو۔''

<u>خ ط و</u>

خَطَا (ن) خَطْوًا: چلنے کے لیے قدم اٹھانا۔

خُطْوَةٌ ج خُطُوٰتٌ: دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ' نقشِ قدم۔ (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''كُلُوْا'' فعل امر ہے۔ اس کا فاعل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔ اس کا مفعول محذوف ہے جو ''رِزْقًا'' ہو سکتا ہے۔ ''مِمَّا فِي الْاَرْضِ'' متعلق فعل ہے۔ ''حَلٰلًا'' محذوف مفعول کی صفت ہے اور ''طَيِّبًا'' اس کی صفت ثانی ہے۔ ''لَا تَتَّبِعُوْا'' فعل نہی ہے۔ اس کا فاعل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔

اُحْلُلْ (فعل امر): تو کھول۔ ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ (طٰہٰ) ''اور تو کھول دے گرہ میری زبان سے۔''

مَحِلٌّ (اسم الظرف): اُترنے کی جگہ۔ ﴿لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (الحج) ''تم لوگوں کے لیے ہیں اس میں کچھ فائدے ایک مقررہ مدت تک' پھر اس کی منزل ہے قدیم گھر کی طرف۔''

حَلِيْلٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر): شوہر (بیوی کے لیے ہمیشہ حلال ہوتا ہے)۔

حَلِيْلَةٌ ج حَلَائِلُ (فَعِيْلٌ کی مؤنث فَعِيْلَةٌ کے وزن پر): بیوی (شوہر کے لیے ہمیشہ حلال ہوتی ہے)۔ ﴿وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ (النساء:۲۳) ''اور بیویاں تمہارے اُن بیٹوں کی جو تمہاری صلب سے ہیں۔''

حِلٌّ (صفت بھی ہے): جائز' حلال۔ ﴿وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ (المائدۃ:۵) ''اور تم لوگوں کا کھانا حلال ہے ان لوگوں کے لیے۔''

حَلَالٌ (صفت بھی ہے): جائز' حلال۔ ﴿هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ﴾ (النحل:۱۱۶) ''یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔''

اَحَلَّ (افعال) اِحْلَالًا: کسی چیز کو جائز کرنا' حلال کرنا۔ ﴿لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (المائدۃ:۸۷) ''حرام مت کرو پاکیزہ چیزوں کو جن کو حلال کیا اللہ نے تمہارے لیے۔''

حَلَّلَ (تفعیل) تَحْلِيْلًا اور تَحِلَّةً: کفارہ ادا کرنا (کسی عہد یا قسم کی پابندی کھولنے کے لیے)۔ ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ (التحریم:۲) ''فرض کیا ہے اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کا کفارہ ادا کرنے کو۔''

خ ط و

خَطَا (ن) خَطْوًا: چلنے کے لیے قدم اٹھانا۔

خُطْوَةٌ ج خُطُوٰتٌ: دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ' نقشِ قدم۔ (آیت زیرِ مطالعہ)

ترکیب: ''كُلُوْا'' فعل امر ہے۔ اس کا فاعل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔ اس کا مفعول محذوف ہے جو ''رِزْقًا'' ہو سکتا ہے۔ ''مِمَّا فِي الْاَرْضِ'' متعلق فعل ہے۔ ''حَلَالًا'' محذوف مفعول کی صفت ہے اور ''طَيِّبًا'' اس کی صفت ثانی ہے۔ ''لَا تَتَّبِعُوْا'' فعل نہی ہے۔ اس کا فاعل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔

''خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ'' مفعول ہے اس لیے اس کا مضاف ''خُطُوٰتِ'' حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ : اے لوگو!	کُلُوْا : تم کھاؤ
مِمَّا : اس میں سے جو	فِی الْاَرْضِ : زمین میں ہے
حَلٰلًا طَیِّبًا : حلال' پاکیزہ (رزق) کو	وَّلَا تَتَّبِعُوْا : اور تم لوگ پیروی مت کرو
خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ : شیطان کے نقشِ قدم کی	اِنَّہٗ : یقیناً وہ
لَکُمْ : تمہارے لیے	عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ : ایک کھلا دشمن ہے

آیت ۱۶۹

اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

ف ح ش

فَحُشَ (ک) فُحْشًا : حد سے زیادہ برا ہونا' بے حیا ہونا (اتنی زیادہ برائی جو فطری حیا کو ختم کر دے)' کھلم کھلا برائی کرنا۔

فَاحِشَۃٌ ج فَوَاحِشُ : ہر وہ چیز جو حد سے زیادہ ہو' بے حیائی' کھلی گمراہی۔ ''وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْھَآ اٰبَآءَنَا'' (الاعراف:۲۸) ''اور جب وہ لوگ کرتے ہیں کوئی کھلی گمراہی تو کہتے ہیں ہم نے پایا اس پر اپنے باپ دادا کو۔'' ''وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ'' (الشوریٰ:۳۷) ''اور جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہ سے اور بے حیائیوں سے۔''

فَحْشَاءُ : قبیح گناہ' اعلانیہ برائی۔ (آیتِ زیرِ مطالعہ)

ترکیب : ''یَاْمُرُ'' فعل ہے۔ اس کا فاعل ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو گزشتہ آیت کے ''الشَّیْطٰنِ'' کے لیے ہے۔ اس کا مفعول ''کُمْ'' کی ضمیر ہے جو گزشتہ آیت کے ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔ ''بِالسُّوْٓءِ'' اور ''اَلْفَحْشَآءِ'' دونوں متعلق فعل ہیں۔ ''بِالسُّوْٓءِ'' میں ''بِ'' حرفِ جر ہے اور ''اَلْفَحْشَآءِ'' سے پہلے حرفِ جر ''بِ'' محذوف ہے' اس لیے یہ دونوں مجرور ہیں۔ ''اَنْ تَقُوْلُوْا'' میں ''اَنْ'' سے پہلے ''یَاْمُرُکُمْ'' محذوف ہے۔

ترجمہ:

اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	یَاْمُرُکُمْ : وہ ترغیب دیتا ہے تم لوگوں کو
بِالسُّوْءِ : برائی کی	وَالْفَحْشَآءِ : اور کھلی گمراہی کی
وَاَنْ : اور یہ کہ	تَقُوْلُوْا : تم لوگ کہو
عَلَی اللّٰہِ : اللہ پر	مَا : وہ جو
لَا تَعْلَمُوْنَ : تم لوگ نہیں جانتے	

آیت ۱۷۰

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ۝

ل ف و

لَفَا (ن) لَفْوًا : کسی چیز کو کم کرنا۔

اَلْفَا (افعال) اِلْفَاءً : کسی چیز کو پالینا۔ (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب : ''اِذَا'' شرطیہ ہے۔ ''قِیْلَ'' سے ''اَنْزَلَ اللّٰہُ'' تک شرط ہے اور ''قَالُوْا'' سے ''اٰبَآءَنَا'' تک جواب شرط ہے۔ ''قِیْلَ لَھُمْ'' میں ''ھُمْ'' کی ضمیر ماقبل آیت ۱۶۸ کے ''النَّاسُ'' کے لیے ہے۔ ''قَالُوْا بَلْ'' میں ''بَلْ'' سے پہلے ''کَلَّا'' محذوف ہے۔ ''عَلَیْہِ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر ''مَا'' کی ضمیر عائد ہے۔ ''اَوَلَوْا'' میں ہمزۂ استفہام ہے اور ''لَوْ'' شرطیہ ہے۔ آگے کا پورا جملہ شرط ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے۔ اردو میں محذوف جواب شرط ''تب بھی'' بنتا ہے۔ ''کَانَ'' کا اسم ''اٰبَآؤُھُمْ'' ہے اس لیے اس کا مضاف ''اٰبَآءُ'' رفع میں ہے۔ ''لَا یَعْقِلُوْنَ'' اور ''لَا یَھْتَدُوْنَ'' دونوں فعلیہ جملے اس کی خبر ہیں۔ ''شَیْئًا'' مفعول مطلق ہے۔

ترجمہ:

وَاِذَا : اور جب بھی	قِیْلَ : کہا جاتا ہے
لَھُمُ : ان لوگوں سے	اتَّبِعُوْا : تم لوگ پیروی کرو
مَا : اس کی جو	اَنْزَلَ : اتارا
اللّٰہُ : اللہ نے	قَالُوْا : تو وہ لوگ کہتے ہیں

بَلْ :(ہرگز نہیں) بلکہ — نَتَّبِعُ :ہم پیروی کرتے ہیں
مَا :اس کی — اَلْفَيْنَا :ہم نے پایا
عَلَيْهِ :جس پر — اٰبَآءَ نَا :اپنے باپ دادا کو
اَوَلَوْ :تو کیا اگر — كَانَ اٰبَآؤُهُمْ :ان کے باپ دادا تھے
لَا يَعْقِلُوْنَ :عقل سے کام نہیں لیتے — شَيْئًا :ذرا بھی
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ :اور نہ ہی ہدایت پاتے تھے (تب بھی)

نوٹ (۱) : مسئلہ یہ ہے کہ ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے باپ دادا اور بزرگ ہدایت پر تھے جبکہ دوسرے گمراہ تھے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس آیت میں ایک کسوٹی دے دی گئی ہے۔ بزرگوں کے جن اقوال و اعمال کی سند ''مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ'' میں یعنی قرآن اور حدیث میں ملتی ہے ان کی تقلید کرنا درست ہے۔ اگر بزرگوں کی کچھ باتوں کی سند قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ بزرگوں کی باتیں نہیں ہیں' بلکہ انہیں غلط طور پر ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہماری عافیت اس میں ہے کہ کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے اس کی سند کے متعلق معلومات ضرور حاصل کر لیں اور اندھی تقلید نہ کریں۔

آیت ۱۷۱

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ
صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾

ن ع ق

نَعَقَ (ض) نَعْقًا: کوے کا کائیں کائیں کرنا' چرواہے کا جانور ہانکنے کے لیے آواز نکالنا' ہانک پکار کرنا۔ (آیت زیر مطالعہ)

ن د و

نَدَا (ن) نَدْوًا: مجلس میں جمع ہونا' مجلس میں جمع کرنا۔

ن د ی

نَدِیَ (س) نَدًى : گیلا ہونا' تر ہونا۔
نَادٍ :فَاعِلٌ کا وزن ہے' لیکن اسم ذات کے طور پر مجلس اور اہل مجلس کے معانی میں آتا

ہے۔﴿وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ﴾ (العنکبوت:۲۹) ''اور تم لوگ آتے ہو اپنی مجلس میں برائی کے ساتھ۔'' ﴿فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ﴾ (العلق) ''پس اسے چاہیے کہ وہ بلائے اپنے اہل مجلس کو''۔

نَدِیٌّ (اسم نسبت): مجالس والا' مجلسی (بیٹھک باز)۔ ﴿اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا﴾ (مریم) ''دونوں فریقوں میں سے کون بہتر ہے بلحاظ رتبہ کے اور زیادہ اچھا ہے بطور مجالس والے کے۔''

نَادٰی (مفاعلہ) نِدَاءً: بلند آواز سے پکارنا (خشک حلق سے نہیں بلکہ تر حلق سے بلند آواز نکلتی ہے)۔ ﴿وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ (الاعراف:٤٤) ''اور آواز دیں گے جنت والے آگ والوں کو۔''

نِدَاءٌ (اسم ذات بھی ہے): بلند آواز۔ (آیت زیر مطالعہ)

مُنَادٍ (اسم الفاعل): آواز دینے والا' پکارنے والا۔ ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ (آل عمران:۱۹۳) ''اے ہمارے ربّ! بے شک ہم نے سنا ایک ندا دینے والے کو جو ندا دیتا ہے ایمان کے لیے۔''

تَنَادٰی (تفاعل) تَنَادٍ: ایک دوسرے کو پکارنا۔ ﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ﴾ (القلم) ''تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا صبح ہوتے ہی۔''

ترکیب: ''مَثَلُ'' مضاف ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ'' مضاف الیہ ہے' جس کا صلہ ''کَفَرُوْا'' ہے۔ یہ پورا فقرہ مبتدا ہے۔ ''مَثَلِ'' بھی مضاف ہے اور حرفِ جر ''كَ'' کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے۔ ''اَلَّذِیْ'' اس کا مضافِ الیہ ہے اور یہ فقرہ خبر ہے۔ ''یَنْعِقُ'' سے ''نِدَاءً'' تک ''اَلَّذِیْ'' کا صلہ ہے۔ ''صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ'' یہ تینوں خبر ہیں اور ان کا مبتدا ''هُمْ'' کی ضمیر محذوف ہے۔

ترجمہ:

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ : اور ان لوگوں کی	کَفَرُوْا : کفر کیا
مثال جنہوں نے	
کَمَثَلِ الَّذِیْ : اس کی مثال کی	یَنْعِقُ : جو ہانک پکار کرتا ہے۔
مانند ہے	
بِمَا : اس کو جو	لَا یَسْمَعُ : سن کر نہیں سمجھتا

اِلَّا : سوائے	دُعَآءً : دعا کے
وَّنِدَآءً : اور آواز کے	صُمٌّ : بہرے ہیں
بُكْمٌ : گونگے ہیں	عُمْيٌ : اندھے ہیں
فَهُمْ : پس وہ لوگ	لَا يَعْقِلُوْنَ : عقل سے کام نہیں لیتے

آیت ۱۷۲

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

ترکیب: ''يٰٓاَيُّهَا'' حرف ندا ہے اور ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' منادیٰ ہے۔ فعل امر ''كُلُوْا'' کا فاعل اس میں شامل ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے۔ اس کا مفعول محذوف ہے جو کہ ''رِزْقَكُمْ'' ہوسکتا ہے۔ ''مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ'' متعلق فعل ہے۔ ''طَيِّبٰتِ'' صفت ہے جس کا موصوف محذوف ہے۔ یہ ''مِنْ'' کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے اور مضاف ہے اس کا مضاف الیہ ''مَا'' ہے۔ شروع سے ''وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ'' تک دونوں جملے جوابِ شرط ہیں۔ ان کی شرط اگلا جملہ ہے۔ ''كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ'' ماضی استمراری ہے لیکن ''اِنْ'' شرطیہ کی وجہ سے ترجمہ حال میں ہوگا۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے ہو
كُلُوْا : تم لوگ کھاؤ	مِنْ طَيِّبٰتِ مَا : اُن پاکیزہ (چیزوں) سے جو
رَزَقْنٰكُمْ : ہم نے عطا کیں تم لوگوں کو	وَاشْكُرُوْا : اور تم لوگ شکر کرو
لِلّٰهِ : اللہ کا	اِنْ كُنْتُمْ : اگر تم لوگ
اِيَّاهُ : صرف اس کی ہی	تَعْبُدُوْنَ : بندگی کرتے ہو

آیت ۱۷۳

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

خ ن ز

خَنِزَ (س) خَنَزًا: گوشت کا سڑاند والا ہونا' بدبودار ہونا۔
خِنْزِیْرٌ ج خَنَازِیْرُ : گلے کی گلٹی' سور۔ ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ (المائدۃ: ٦٠) ''اور اس نے بنائے ان میں سے بندر اور سور۔''

ہ ل ل

هَلَّ (ن) هَلًّا : نیا چاند ظاہر ہونا' قمری مہینہ شروع ہونا۔
هِلَالٌ ج اَهِلَّةٌ : ابتدائی اور آخری راتوں کا باریک چاند۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ (البقرۃ:١٨٩) ''یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے باریک چاندوں کے بارے میں۔''
اَهَلَّ (افعال) اِهْلَالًا: (نیا چاند دیکھ کر) آواز دینا' پکارنا۔ (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''حَرَّمَ'' فعل ہے' اس کا فاعل اس میں موجود ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے۔ ''عَلَيْكُمُ'' متعلق فعل ہے۔ ''اَلْمَيْتَةَ' اَلدَّمَ' لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ'' اور ''مَا'' یہ سب ''حَرَّمَ'' کے مفعول ہیں۔ ''مَا'' موصولہ ہے ''اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ'' اس کا صلہ ہے۔ ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ ''اُضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'' شرط ہے جبکہ ''فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ'' جواب شرط ہے۔ ''اُضْطُرَّ'' بابِ افتعال کا ماضی مجہول ہے۔ ''غَيْرَ بَاغٍ'' حال ہے' اس لیے مضاف ''غَيْرَ'' پر نصب آئی ہے اور ''بَاغٍ'' مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے۔ ''عَادٍ'' سے پہلے ''غَيْرَ'' محذوف ہے اس لیے یہ حالت جر میں ہے اور یہ بھی حال ہے۔ ''فَلَا اِثْمَ'' میں لائے نفیٔ جنس ہے اس لیے ''اِثْمَ'' تنوین کے بغیر حالتِ نصب میں آیا ہے۔

ترجمہ:

اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	حَرَّمَ : اس نے حرام کیا
عَلَيْكُمُ : تم لوگوں پر	الْمَيْتَةَ: مردار کو
وَالدَّمَ : اور خون کو	وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ : اور سور کے گوشت کو
وَمَا : اور اس کو	اُهِلَّ : پکارا گیا
بِهٖ : جس پر	لِغَيْرِ اللّٰهِ : اللہ کے بغیر
فَمَنِ : پس جو	اضْطُرَّ : لاچار کیا گیا
غَيْرَ بَاغٍ : اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو	وَّلَا عَادٍ : اور نہ حد سے گزرنے والا ہو

فَلَا اِثْمَ :تو کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں   عَلَیْهِ :اس پر
ہے
اِنَّ اللّٰهَ :یقیناً اللہ   غَفُوْرٌ :بے انتہا بخشنے والا ہے
رَّحِیْمٌ :ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

نوٹ (۱) :اس آیت میں ''وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ'' کے الفاظ نسبتاً زیادہ غور طلب ہیں۔ مردار' خون اور سور کا نام لینے کے بعد کسی چیز کا نام نہیں لیا گیا' بلکہ ''وَمَا'' (اور اس کو) کہا گیا جس کی وجہ سے اس میں عمومیت پیدا ہوگئی اور اس میں ہر وہ چیز (صرف جانور نہیں) شامل ہو جائے گی جس پر آیت کے اس حصے کا اطلاق ہوگا۔ اسی طرح ''اُهِلَّ'' (پکارا گیا) کے ساتھ نام کے لفظ کا صراحتاً ذکر نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے اس میں بھی عمومیت پیدا ہوئی اور اس میں نام پکارنے کے علاوہ دیگر نیتیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس بنیاد پر علماء کرام چار صورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جس کی تفصیل معارف القرآن میں دی ہوئی ہے۔ ہم ان چار صورتوں کی صرف نشاندہی کر دیتے ہیں۔

۱) ایسا جانور جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے۔
۲) ایسا جانور جس کو ذبح کرتے وقت نام تو اللہ کا لیا جائے لیکن اس سے مقصود غیر اللہ کا تقرب ہو۔
۳) کسی جانور پر علامت لگا کر غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کے خیال سے چھوڑ دیا جائے اور اس سے کوئی کام وغیرہ نہ لیا جائے' تو یہ عمل حرام ہے۔ البتہ کوئی دوسرا شخص ایسا کوئی جانور خرید کر اگر ذبح کر کے کھائے تو اس کے لیے حلال ہے۔
۴) جانوروں کے علاوہ ایسی دوسری چیزیں مثلاً مٹھائی یا کھانا وغیرہ بھی حرام ہیں جن پر غیر اللہ کے نام کی نذر (منت) مانی گئی ہو۔

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

خَیْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے''

(رواہ البخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

سلسلۂ نباتات قرآن (قسط 11)

فُوم
(Garlic)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

قرآنی نام: فُوم
سنسکرت، ہندی، اردو، گجراتی: لہسن
عربی: ثوم
کشمیری: روہن
پنجابی، فارسی: تھوم۔ثُوم
اطالوی: ایلیم
عبرانی: شومیم
انگریزی: گارلک
نباتاتی نام: Allium sativum Linn

قرآن مجید میں صرف ایک بار، سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ میں لہسن کا ذکر آیا ہے:

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے، لہٰذا اپنے ربّ سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار ساگ، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گیہوں، لہسن، پیاز اور دال وغیرہ پیدا کرے''۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''بقل'' کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کی تمام اقسام کے لیے عام ہے۔ ''قثاء'' کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔ فوم اور ثوم ایک ہی چیز ہے۔ اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ اہل عرب ''ث'' کو کبھی کبھی ''ف'' سے بدل دیا کرتے ہیں، مثلاً عاثور کو عافور اور اثافی کو اثافی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ''تھوم'' کا لفظ بھی یہیں سے چلا ہوا معلوم ہوتا ہے''۔

بعض مفسرین نے قرآنی لفظ ''فوم'' کو گندم یا غلے کے ہم معنی بتایا ہے' لیکن علامہ عبداللہ یوسف علی' مولانا عبداللطیف اور مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک لہسن کے لیے یہ لفظ ''فوم'' اس قدر مشہور ہے کہ اس سے روٹی یا گندم یا غلہ وغیرہ مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا اصلاحی ذرا سخت لہجے میں تاکیداً لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کی تاویل ہمیشہ الفاظ کے مشہور معانی کے لحاظ سے کرنی چاہیے''۔

لہسن کی اہمیت غذائیات میں بنیادی طور پر اس کے دوائی فوائد میں مضمر ہے۔ لہسن کو پیاز' ادرک اور نمک مرچ کے ساتھ دالوں اور ترکاریوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اس کو کچا کھایا جائے تو اس کا مزا تیز اور بُو ناگوار ہوتی ہے' لیکن اللہ نے اس میں کچھ خوبیاں ایسی رکھی ہیں جن کی وجہ سے یہ غذا کا ایک جزو بن گیا ہے۔ مثلاً یہ گوشت' مچھلی وغیرہ بساندھ والی چیزوں کی بساندھ دور کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے انسان خراب آب و ہوا کے نقصانات سے محفوظ رہتا ہے۔ معدے کو تقویت دیتا اور ریاح کو نکالتا اور کھانسی اور دمہ میں بلغم کو نکالتا ہے۔ فالج ولقوہ میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ خون کے دباؤ کو کم کرتا ہے اور بعض جلدی امراض کو دور کرتا ہے۔

ان امراض میں لہسن زمانۂ قدیم سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اب زمانۂ جدید کی طبی تحقیقات نے بھی اس کے فوائد کی تصدیق کر دی ہے۔ حکیم محمد سعید شہید (صاحب ہمدرد) لکھتے ہیں:

> ''اس میں ایک خاص قسم کا تیل ہوتا ہے۔ انسان کے بدن میں پہنچنے کے بعد اس کی نکاسی پھیپھڑوں اور جلد کے ذریعے ہوتی ہے' لہٰذا لہسن پھیپھڑوں کی سِل' کھانسی' دمہ اور کالی کھانسی میں فائدہ دیتا ہے اور اس کی بو ان امراض میں خاص طور پر مفید ہے۔ کالی کھانسی میں لہسن کے فائدے سے عام لوگ بھی واقف ہیں۔ چنانچہ لہسن کی پوتھیاں چھیل کر دھاگے میں پرو کر بچے کے گلے میں ڈال دیتے ہیں' تاکہ اس کی بُو ناک کے راستے پھیپھڑوں میں پہنچ کر سکون دے۔ اس کے علاوہ کالی کھانسی میں لہسن کے استعمال کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لہسن کو چھیل کر بچے کے پاؤں کے تلووں کے نیچے رکھ کر اوپر سے جراب اور جوتا پہنا دیتے ہیں۔ پھیپھڑوں کی سِل میں لہسن کا سونگھنا اور اس کی ایک دو پوتھی شہد میں ملا کر چٹانا بھی مفید ہے''۔

فالج ولقوہ میں بھی لہسن کا استعمال مفید ہے۔ گٹھیا اور کھانسی دمہ میں ایک دو پوتھی شہد میں ملا کر کھلائی جاتی ہے۔ بیرونی طور پر استعمال کرنے سے لہسن پھلبہری' چھیپ اور داد کو بہت

فائدہ دیتا ہے۔اس غرض کے لیے لہسن کو نوشادر کے ساتھ پیس کر لگایا جاتا ہے۔

بالخورہ کے مرض میں داڑھی' مونچھ اور سر کے بال جگہ جگہ سے اڑ جاتے ہیں' جس سے انسان کی شکل بگڑ جاتی ہے اور وہ ہر وقت ذہنی کوفت میں مبتلا رہتا ہے۔لہسن کا استعمال بالخورہ کو دور کرنے کے لیے جادو کا اثر رکھتا ہے۔لہسن کی چند پوتھیاں ایک چٹکی سرمہ کے ساتھ پیس کر لگا دینے سے از سر نو بال اُگ آتے ہیں اور بالخورہ غائب ہو جاتا ہے۔

لہسن کو پیس کر درد والی جانب لگانے سے آدھے سر کا درد دُور ہو جاتا ہے' اور پھوڑے پھنسیوں پر لگانے سے وہ بہت جلد گھل جاتی ہیں۔

اگر کان میں پھنسی ہو تو وہ بھی لہسن کا پانی کان میں ٹپکانے سے گھل جاتی یا پک کر پھوٹ جاتی ہے۔

اگر دانت میں کیڑا لگا ہو اور اس کی وجہ سے درد بے چین رکھتا ہو' لہسن کی پوتھی گرم کر کے دانت پر رکھ کر کچھ دیر دبائے رکھنے سے مکمل آرام ہو جاتا ہے۔

بچھو کے کاٹے کے لیے بھی لہسن فائدہ دیتا ہے۔پیس کر لگائیں اور اسی کو کھلائیں۔

گٹھیا وغیرہ کے دردوں کے لیے صرف لہسن کو یا دوسری مناسب دواؤں کے ساتھ تیل میں پکا کر صاف کر لیتے ہیں اور پھر اس تیل کی نیم گرم مالش کرتے ہیں' نہایت مفید ہے۔

تازہ ترین طبی تحقیق کا فیصلہ ہے کہ لہسن دل میں کولسٹرول کی بہتات دور کرنے اور والو کھولنے میں بڑا مفید ہے۔ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے درمیان' جب معدہ بھرا ہوا نہ ہو' لہسن کی دو تین پوتھیاں یکے بعد دیگرے چبانے سے اور اُس کا عرق لعابِ دہن میں شامل کرنے سے دل میں جما ہوا کولسٹرول لعاب کی شکل میں باہر آ جاتا ہے۔منہ لٹکا کر دیر تک تھوکتے رہیے۔لعاب نگلنے سے بند والو کھل جاتی ہے۔امراضِ قلب کے علاج میں لہسن کا استعمال نیا نیا وارد ہوا ہے اور بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

لہسن بھی نباتات قرآن کی فہرست میں شامل ہو کر حکمت قرآن کا ایک زندۂ جاوید ثبوت ہے جو روزِ اوّل سے آج تک پوری انسانیت کو' مذہب' رنگ و نسل' زبان کے امتیازات سے ماوراء' فائدے پہنچا رہا ہے۔

❁❁❁

مصاحف عثمانیہ

ایک تاریخی اور ارتقائی جائزہ

تحقیق و تحریر: حافظ محمد زبیر ☆

جمع قرآن

جمع قرآن کا لفظ بعض اوقات حفظ و استظہار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات اس سے مراد کتابت ہوتی ہے' یعنی قرآن کو کلمات' آیات اور سُوَر کی شکل میں صحائف میں سطور کے مابین لکھنا۔ جمع قرآن بمعنی کتابت صدرِ اوّل میں تین مرتبہ ہوا۔ پہلی مرتبہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں' دوسری مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور تیسری مرتبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں۔ ذیل میں ہم ان ادوارِ ثلاثہ میں جمع قرآن کی کیفیت و نوعیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

دورِ نبویؐ میں جمع قرآن

ہر زمانے میں علوم کی حفاظت کے کچھ ذرائع و وسائل ہوتے ہیں جو کہ اس زمانے کے حالات و واقعات کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ نزولِ قرآن سے پہلے اہل عرب میں علوم کی حفاظت کا اصل ذریعہ حفظ تھا' کیونکہ کتابت اُس دَور میں بہت مشکل تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اشعار کے بڑے بڑے دیوان' لمبے چوڑے نسب نامے' اپنے آباء و اجداد کی لڑائیوں کے قصے انہوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھے تھے۔ اس لیے اس وقت قرآن کی حفاظت کا اصل ذریعہ حفظ تھا' لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کے حفظ و استظہار کے ساتھ ساتھ اس کی کتابت کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی اور بہت سارے صحابہ کی یہ ذمہ داری مقرر کی۔ جب بھی قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ ان

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو بلوا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ قرآن مجید کی کتابت کرتے تھے' کاتبین وحی کے نام سے مشہور تھے۔ تاریخ و سیرت کی کتب میں تقریباً ۴۰ صحابہ کے نام ملتے ہیں جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کو لکھا کرتے تھے۔ ان میں چند ایک مشہور صحابہ یہ ہیں: حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت معاویہ' حضرت خالد بن ولید' حضرت ابی بن کعب' حضرت زید بن ثابت' حضرت ثابت بن قیس وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چین میں اگرچہ ورق ایجاد ہو چکا تھا اور اہل چین اس کو استعمال بھی کرتے تھے لیکن عرب میں ورق کی صنف ابھی تک متعارف نہیں ہوئی تھی' جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام طور پر درختوں کے پتوں' جانوروں کے چمڑوں' بڑی بڑی پتھر کی سلوں' جانوروں کے شانے کی ہڈیوں اور کھجور کی شاخوں پر قرآن مجید کی آیات کو لکھا کرتے تھے۔ مختلف اشیاء پر مکتوب مکمل قرآن مجید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی اکٹھا کیا گیا' لیکن یہ کسی مصحف یا صحیفے کی شکل میں نہ تھا' بلکہ متفرق چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔

عہد رسالت میں قرآن کی کتابت

بعض مستشرقین اگرچہ عہد رسالت میں قرآن کی کتابت کا انکار کرتے ہیں لیکن درج ذیل احادیث ان مستشرقین کے اس بودے موقف کا ردّ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم نَهٰى اَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ اِلٰى اَرْضِ الْعَدُوِّ (۱)

''بے شک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ قرآن کے ساتھ دشمن کی سرزمین کی طرف سفر کیا جائے''۔

اس روایت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں قرآن سے مراد مکتوب قرآن ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس احتیاط کے پیش نظر کہ غیر مسلم قرآن مجید کی بے حرمتی نہ کریں قرآن کو دشمنوں کی سرزمین میں لے جانے سے منع کیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے واقعہ سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی یادداشت کے لیے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا اور بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب السفر بالمصاحف الی ارض العدو۔

سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت عمر اُن کے اسلام کی خبر سن کر غصے میں بھرے ہوئے اُن کے گھر میں داخل ہوئے تو ان دونوں میاں بیوی کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیات درج تھیں اور حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ان کو پڑھا رہے تھے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس قرآن کریم لکھا ہوا موجود تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو دیکھ کر پڑھنے اور دشمن کی سرزمین میں لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن کی کتابت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت کو سنبھالا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے ابتدائی دَور میں ہی بہت سی مشکلات اور حوادث کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مشکلات میں سے ایک مسلمانوں اور مرتدین کے درمیان ہونے والی جنگ یمامہ تھی۔ مسیلمہ کذاب (جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) کی تعلیمات سے متاثر ہو کر بہت سارے نومسلم قبیلے مرتد ہو گئے جس کے سبب سے مسیلمہ کذاب اور مسلمانوں کے درمیان جنگ یمامہ ہوئی۔ اس جنگ میں ستر کے قریب حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ بعض مؤرخین نے یہ تعداد پانچ سو تک بھی بتائی ہے۔ ان شہداء میں مولیٰ ابی حذیفہ سالم رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپؓ کو تجویز پیش کی کہ قرآن کو ضائع ہونے سے پہلے پہلے ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ شروع میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے توقف کیا لیکن بعد میں آپؓ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متفق ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (کاتب وحی) کو اس کام کے لیے منتخب فرمایا اور ان کو بلا کر ان کے سامنے یہ فکر پیش کی۔ حضرت زیدؓ نے بھی شروع میں تأمل کیا لیکن حضرت ابوبکرؓ ان کے شکوک وشبہات کو دور کرتے رہے اور جمع قرآن کی مصلحتیں بیان کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ، عمر اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگرانی میں قرآن کو جمع کرنے کے کام کا آغاز کیا' اس بارے میں صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابتؓ ہی سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں:

اَرْسَلَ اِلَیَّ اَبُوْبَکْرٍ مَقْتَلَ اَھْلِ الْیَمَامَۃِ فَاِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَہٗ۔ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِیْ فَقَالَ : اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ

الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْآنِ وَإِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ يَّسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ كَثِيْرٌ مِّنَ الْقُرْآنِ وَإِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ۔ قُلْتُ لِعُمَرَ : كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ عُمَرُ : هٰذَا وَاللّٰهِ خَيْرٌ، فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِيْ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِذٰلِكَ وَرَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَاٰى عُمَرُ، قَالَ زَيْدٌ : قَالَ اَبُوْبَكْرٍ : اِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَا نَتَّهِمُكَ، وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ۔ فَوَ اللّٰهِ لَوْ كَلَّفُوْنِيْ نَقْلَ جَبَلٍ مِّنَ الْجِبَالِ مَا كَانَ اَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا اَمَرَنِيْ بِهٖ مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ! قُلْتُ: كَيْفَ تَفْعَلُوْنَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ؟ قَالَ هُوَ وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ اَبُوْبَكْرٍ يُرَاجِعُنِيْ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ اَجْمَعُهٗ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰى وَجَدْتُّ آخِرَ سُوْرَةِ التَّوْبَةِ مَعَ اَبِيْ خُزَيْمَةَ الْاَنْصَارِيِّ لَمْ اَجِدْهَا مَعَ اَحَدٍ غَيْرِهٖ ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ حَتّٰى خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ۔ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ اَبِيْ بَكْرٍ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهٗ، ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ (۱)

''جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکر ؓ نے مجھے بلا بھیجا۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت عمرؓ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ جنگ یمامہ میں قراء صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس طرح اگر مختلف مواقع پر قراء کی بڑی تعداد شہید ہوتی رہی تو قرآن کا بہت سارا حصہ ضائع نہ ہو جائے' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن کے جمع کرنے کا حکم دیں۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا میں ایسا کام کیسے کروں جو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا اللہ کی قسم! یہ کام خیر ہی خیر ہے۔ پس حضرت عمرؓ مجھے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرے سینے کو کھول دیا اور اب میری بھی اس مسئلے میں وہی رائے ہے جو کہ حضرت عمرؓ کی رائے ہے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب جمع القرآن۔

(اے زید!) بے شک تم ایک نوجوان اور سمجھ دار آدمی ہو اور ہمیں تمہارے اوپر اعتماد بھی ہے اور تم اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں وحی بھی لکھا کرتے تھے' پس تم قرآن کی آیات کو تلاش کر کے جمع کرو۔ (حضرت زیدؓ فرماتے ہیں) اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو میرے اُوپر اتنا گراں نہ گزرتا جتنا جمع قرآن کا حکم میرے اوپر گراں گزرا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! یہ کام خیر ہی خیر ہے۔ پس حضرت ابوبکرؓ مسلسل مجھے یہ بات کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس بات کے لیے کھول دیا جس کے لیے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے سینے کو کھولا تھا۔ پس میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور کھجور کی شاخوں' پتھر کی سلوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن جمع کیا' یہاں تک کہ سورۃ التوبۃ کی آخری آیت ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ حضرت ابوخزیمہ انصاریؓ کے علاوہ کسی کے پاس نہ پائی۔ یہ صُحُف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی' پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے' پھر اُن کی وفات کے بعد اُم المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے پاس چلے گئے''۔

صُحفِ ابی بکرؓ کی خصوصیات

سب سے پہلی بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع شدہ قرآن کے لیے ابن حجر وغیرہ نے فتح الباری میں مُصْحَف کی جگہ صُحُف کا لفظ نقل کیا ہے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع قرآن کے لیے صُحُف کی جگہ مُصْحَف یا مصاحف کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع ہونے والے قرآن کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

۱) یہ قرآن مختلف صحف (صحیفوں) کی شکل میں تھا۔ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ سورتوں میں آیات تو ترتیب کے ساتھ تھیں لیکن یہ سورتیں مرتب نہ تھیں' بلکہ الگ الگ صحیفوں کی شکل میں ان سورتوں کو اکٹھا کر کے ایک مصحف کی شکل دے دی گئی تھی جو کہ درحقیقت چھوٹے چھوٹے صحف پر مشتمل تھا۔

۲) ان صحف میں ان آیات کو درج کیا گیا جن کی تلاوت منسوخ نہ ہوئی تھی۔

۳) ان صحف کی صحت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا' جس کی وجہ سے ان کو اُمت

میں ایک سند کی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ بعض دوسرے صحابہ مثلاً حضرت علی ؓ وغیرہ نے انفرادی طور پر قرآن کو جمع کرنے کی کوششیں کیں لیکن حضرت ابوبکر ؓ کو اس لیے جامع القرآن کہا گیا کہ ان کے جمع شدہ قرآن کو پوری اُمت نے تسلیم کیا اور اس پر صحابہ کا اجماع تھا' جبکہ باقی مصاحف کی اہمیت زیادہ سے زیادہ انفرادی نسخوں کی تھی' جن میں سے بعض نسخ میں ایسی منسوخ التلاوۃ آیات بھی شامل تھیں جن کے نسخ کا بعض صحابہ کرام ؓ کو علم نہ ہو سکا تھا۔

حضرت عثمان غنی ؓ کے دَور میں جمع قرآن

حضرت عثمان ؓ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اسلامی سلطنت کی سرحدیں مکہ و مدینہ سے نکل کر روم و ایران کی سرزمین تک پھیل گئیں۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ یہ نومسلم اپنے علاقوں میں موجود صحابہ کرام ؓ اور ان کے شاگردوں سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کو سات حروف پر اُتارا گیا۔ جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے اُس وقت تک تو کوئی اختلاف سامنے نہ آیا' لیکن آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے صحابہ کرام ؓ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ ان میں سے ہر صحابی کو اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف قراءت پڑھائی تھی' جو کہ دوسرے صحابیؓ کو معلوم نہ تھی۔ جب ان صحابہ کرام ؓ نے مختلف بڑے بڑے اسلامی شہروں میں جا کر لوگوں کو اپنی اپنی قراءت کے مطابق قرآن کی تعلیم دی تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیدا ہونے لگے۔

مثلاً اہل شام حضرت ابی بن کعب ؓ کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے اور اہل کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی قراءت کو ترجیح دیتے تھے اور ان کے علاوہ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کی قراءت لیتے تھے جس کی وجہ سے حروف کی ادائیگی اور وجوہِ قراءت میں لوگوں کے درمیان اختلاف بڑھتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد چونکہ یہ اختلاف کھل کر سامنے آیا تھا لہٰذا یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ اختلاف بہت بڑے فتنے کا سبب بن جائے گا اور لوگ قرآن کی متواتر قراءات کو غلط قرار دے کر سنگین جرم کے مرتکب ہوں گے۔ حضرت زید بن ثابت ؓ کے نسخے کے علاوہ جو کہ اُس وقت مدینہ طیبہ میں حضرت حفصہ بنت عمر ؓ کے پاس موجود تھا' دوسرا کوئی ایسا معیاری نسخہ نہ تھا جو کہ پوری اُمت کے لیے حجت بن سکتا۔ چونکہ صحابہ کرام ؓ کے انفرادی نسخے اپنی اپنی قراءت کے مطابق رسم الخط

میں لکھے ہوئے تھے اور ان انفرادی نسخوں میں ساتوں حروف کے جمع کرنے کا اہتمام نہ کیا گیا تھا لہٰذا ہر صحابی اپنے پاس موجود مصحف سے اس کے رسم الخط کے مطابق تلاوت کرتا تھا۔ اور بعض اوقات جب کوئی تابعی ایسے حروف کی ادائیگی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا جو کہ کسی دوسرے صحابی کے شاگرد تابعی کے مصحف کے رسم الخط کے مطابق نہ ہوتی تو وہ اس پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیتا۔ ابن ابی داؤد ''المصاحف'' میں ابوقلابہ کے طریق سے نقل کرتے ہیں:

''لَمَّا كَانَتْ خِلَافَةُ عُثْمَانَ جَعَلَ الْمُعَلِّمُ يُعَلِّمُ قِرَاءَةَ الرَّجُلِ، وَالْمُعَلِّمُ يُعَلِّمُ قِرَاءَةَ الرَّجُلِ فَجَعَلَ الْغِلْمَانُ يَلْتَقُوْنَ فَيَخْتَلِفُوْنَ حَتّٰى ارْتَفَعَ ذٰلِكَ اِلَى الْمُعَلِّمِيْنَ، حَتّٰى كَفَّرَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُثْمَانَ، فَخَطَبَ فَقَالَ: ''اَنْتُمْ عِنْدِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فَمَنْ نَاٰى عَنِّيْ مِنَ الْاَمْصَارِ اَشَدُّ اخْتِلَافًا'' (۱)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بعض معلمین قرآن نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا جبکہ دوسرے معلمین نے دوسری قراءت کے مطابق۔ اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب آپس میں ملتے تو اختلاف کرتے۔ بعض اوقات یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے۔ یہ ساری بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچی۔ انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے اختلاف کرتے ہو تو جو لوگ مجھ سے دور دوسرے شہروں میں ہیں وہ تو اختلاف میں اور زیادہ سخت ہوں گے!''

قراءات کے اس اختلاف کے سبب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کا ایک ایسا نسخہ تیار کرنے کا ارادہ کیا جو سب کے لیے واجب الاقتداء ہو۔ اس غرض سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہ صحیفے منگوائے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اکٹھے کیے گئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ کرام حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی اور انہیں اس کام پر مأمور کیا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کریں جو کہ سورتوں کے اعتبار سے مرتب ہوں۔ شروع میں یہ چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کام پر مأمور تھے، بعد میں ان کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی۔

(۱) مناھل العرفان، علامہ عبدالعظیم زرقانی، ج ۱، ص ۲۴۹۔

امام بخاریؒ نے اس سارے واقعے کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اَنَّ حُذَیْفَةَ بْنَ الْیَمَانِ قَدِمَ عَلٰی عُثْمَانَ وَکَانَ یُغَازِیْ اَھْلَ الشَّامِ فِیْ فَتْحِ اِرْمِیْنِیَةَ وَاَذْرَبِیْجَانَ مَعَ اَھْلِ الْعِرَاقِ، فَاَفْزَعَ حُذَیْفَةَ اخْتِلَافُھُمْ فِی الْقِرَاءَةِ فَقَالَ حُذَیْفَةُ لِعُثْمَانَ: یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَدْرِكْ ھٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ یَّخْتَلِفُوْا فِی الْکِتَابِ، اخْتِلَافَ الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی۔ فَاَرْسَلَ عُثْمَانُ اِلٰی حَفْصَةَ اَنْ اَرْسِلِیْ اِلَیْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُھَا فِی الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّھَا اِلَیْكِ فَاَرْسَلَتْ بِھَا حَفْصَةُ اِلٰی عُثْمَانَ فَاَمَرَ زَیْدَ بْنَ ثَابِتٍ، وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الزُّبَیْرِ وَسَعِیْدَ بْنَ الْعَاصِ وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الْحَارِثِ بْنِ ھِشَامٍ، فَنَسَخُوْھَا فِی الْمَصَاحِفِ وَقَالَ عُثْمَانُ لِلرَّھْطِ الْقُرَیْشِیِّیْنَ الثَّلَاثَةِ: اِذَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِیْ شَیْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَاکْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَیْشٍ، فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِھِمْ فَفَعَلُوْا حَتّٰی اِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ فِی الْمَصَاحِفِ رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ اِلٰی حَفْصَةَ وَاَرْسَلَ اِلٰی کُلِّ اُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوْا وَاَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْاٰنِ فِیْ کُلِّ صَحِیْفَةٍ اَوْ مُصْحَفٍ اَنْ یُّحْرَقَ۔(۱)

''حضرت حذیفہ بن یمان ؓ حضرت عثمان ؓ کے پاس آئے اور اس زمانے میں اہل شام اہل عراق کے ساتھ مل کر آرمینیہ اور آذربائیجان میں جہاد کر رہے تھے۔ حضرت حذیفہ ؓ کو لوگوں کے قرآن کے اختلاف سے بڑا ڈر پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس آ کر کہا اے امیر المؤمنین! اس اُمت کا پہلے سے ہی انتظام کر دیں، یہ نہ ہو کہ وہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف کرنے لگیں۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہ ؓ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہمیں حضرت ابوبکر ؓ کے دور میں جمع کردہ صحف بھجوا دیں، ہم انہیں نقل کر کے اصل نسخہ آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحف حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام ؓ کو حکم دیا کہ وہ اس کو مصاحف میں نقل کریں۔ حضرت عثمان ؓ نے تینوں قریشی صحابہ سے کہا کہ جب تمہارا حضرت زید بن ثابت

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن۔

سے کسی جگہ اختلاف ہو جائے تو اس کو قریش کی زبان میں لکھنا (حضرت زید بن ثابت انصاری صحابی تھے) کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب ان صحابہ کرام نے صحف کو مصاحف میں نقل کر لیا تو حضرت عثمانؓ نے صحف حضرت حفصہ کو واپس لوٹا دیے اور ہر طرف ان لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق مصاحف پھیلا دیے اور ان کے علاوہ جتنے بھی صحائف یا مصحف تھے ان کو جلانے کا حکم دیا''۔

مصاحفِ عثمانیہ کی تعداد

ابوعمرو دانی کی تحقیق کے مطابق جمہور علماء کے نزدیک مصاحف عثمانیہ کی تعداد چار تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ' بصرہ اور شام میں ایک ایک مصحف بھیجا جبکہ ایک اپنے پاس رکھا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ان مصاحف کی تعداد سات تھی اور حضرت عثمانؓ نے سابقہ تین شہروں کے علاوہ مکہ' یمن اور بحرین کی طرف بھی ایک ایک مصحف بھیجا۔ ابوعمرو دانی کا کہنا ہے کہ پہلا قول اصح ہے اور ائمہ اُمت کا بھی یہی قول ہے۔ امام سیوطی اور ابن حجر کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ مصاحف تعداد میں کل پانچ تھے۔

مصاحفِ عثمانیہ کی خصوصیات

۱) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہ تھیں' بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ ان حضرات نے تمام سورتوں کو جمع کر کے موجودہ ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔ ہر سورت کے آغاز میں آیت بسم اللہ لکھی گئی' سوائے سورۂ براءۃ کے۔

۲) قرآن کریم کی آیات کو لکھتے وقت ایسے رسم الخط کا انتخاب کیا گیا جس میں تمام قراءات سما جائیں۔ جس جگہ ایک رسم الخط میں ساری قراءات اکٹھی نہ ہو سکتی تھیں' جیسا کہ حذف و زیادت کے اختلافات ہیں' تو ایک مصحف میں ایک رسم الخط کے مطابق اور دوسرے مصحف میں دوسرے رسم الخط کے مطابق لکھا گیا۔ جیسا کہ ایک قراءت کے مطابق ﴿وَوَصّٰی بِهَا اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ اور دوسری قراءات میں ﴿وَاَوْصٰی بِهَا اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ ہے۔ یہ ''وَصّٰی'' اور ''اَوْصٰی'' کا اختلاف ایسا ہے جس کو ایک رسم الخط میں جمع کرنا مشکل ہے' لہٰذا ایک مصحف میں ایک قراءت کے مطابق رسم الخط رکھا گیا اور دوسرے مصحف میں دوسری قراءت کے مطابق رسم الخط رکھا گیا۔

۳) آیاتِ قرآنیہ کو لکھتے وقت اعراب اور نقطوں سے خالی رکھا گیا' تاکہ تمام متواتر قراءتیں اس میں سما جائیں۔ جیسا کہ آیہ مبارکہ ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ میں آخری لفظ کو ''سرھا'' لکھا گیا' تاکہ اس کو دو طرح سے ''نُنْشُرُهَا'' اور ''نُنْشِزُهَا'' پڑھا جا سکے' جبکہ دونوں متواتر قراءات ہیں۔

۴) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ صرف ایک تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اس مجمع علیہ مصحف کی کئی زائد نقول تیار ہو گئیں۔

۵) یہ مصاحف تمام منسوخ آیات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُن تفسیری کلمات سے پاک تھے جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے مصاحف میں بعض اوقات لکھ لیتے تھے اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ لوگ ان کو قرآن کا حصہ سمجھ کر ان کی تلاوت کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ بہت ساری منسوخ التلاوۃ آیات بھی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مصاحف میں لکھی ہوئی تھیں' کیونکہ ان کو ان آیات کے منسوخ ہونے کا علم نہ ہو سکا تھا۔

صُحُفِ ابی بکر اور مصاحفِ عثمانیہ کا فرق

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحف میں قرآن کو جمع کیا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف میں قرآن مجید کو جمع اور نقل کیا۔ صُحُف ''صَحِيْفَةٌ'' کی جمع ہے۔ لغت میں اس سے مراد ورق یا چمڑے کا ٹکڑا ہے جس پر لکھا جائے۔

مُصْحَف ''اَصْحَفَ'' سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی ''جمع کرنے'' کے ہیں۔ گویا کہ مُصْحَف سے مراد ''جمع کیا ہوا'' ہے۔ مُصْحَف کے لغوی معنی میں دُفَّتَیْن شامل ہیں جو کہ مختلف اوراق اور صحف کو جمع کرنے کے لیے جوانب کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اصطلاحی طور پر صحف سے مراد مجرد اوراق ہیں جن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن جمع کیا گیا۔ یہ اوراق سورتوں پر مشتمل تھے جن میں صرف آیات مرتب تھیں جبکہ ہر سورت علیحدہ علیحدہ لکھی ہوئی تھی اور مصاحف سے مراد وہ اوراق ہیں جن میں قرآن مجید آیات و سُوَر کی ترتیب سے اسی طرح جمع کیا گیا جس طرح سے یہ آج ہمارے پاس موجود ہے' اور اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اُمت کا اجماع ہو گیا۔

مصاحفِ عثمانیہ کی تجوید و تحسین

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں تیار شدہ مصاحف پر اُمت کا اجماع ہو گیا لہٰذا قرآن کو

رسم عثمانی کے خلاف لکھنا حرام قرار دیا گیا۔ صحابہ وتابعین نے ان مصاحف عثمانیہ کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر نشر واشاعت کی۔ لیکن چونکہ ابھی تک یہ مصاحف اعراب وحرکات اور نقاط سے خالی تھے لہٰذا عجمی ممالک کے نومسلم معاشروں کے افراد کے لیے ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی۔ تسہیل تلاوت کے لیے مختلف اوقات میں مسلم حکومتوں کی سرپرستی میں ان مصاحف عثمانیہ میں نقاط' حرکات' اعراب' رکوعات وغیرہ کا اضافہ کیا گیا تاکہ لوگوں کو تلاوت میں سہولت وآسانی رہے۔ ذیل میں ہم ان اضافوں اور ان کے شرعی حکم پر بحث کریں گے۔

مصاحفِ عثمانیہ کے نقطے

مصاحفِ عثمانیہ شروع میں نقطوں سے خالی تھے۔ بعض مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ کی نقل کے وقت اہل عرب نقطوں کے استعمال سے ناواقف تھے۔ بعد میں ابوالاسود الدولی نے نقطوں کو متعارف کروایا۔ جبکہ ایک دوسری رائے کے مطابق اسلام سے قبل نقطے کلامِ عرب میں معروف تھے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصاحف عثمانیہ کو نقل کرتے وقت جان بوجھ کر نقطوں کو ترک کر دیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ سبعۃ اَحرف کو ایک ہی مصحف کے رسم الخط میں جمع کیا جا سکے۔

اس بارے میں بھی مؤرخین کا اختلاف ہے کہ قرآن پر نقطے لگانے کا کام سب سے پہلے کس نے کیا۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے ابوالاسود الدؤلی نے نقطے لگائے۔ بعض کے نزدیک اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی ہدایت پر حجاج بن یوسف نے نصر بن عاصم اللیثی اور یحییٰ بن یعمر العدوانی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ قرآن کریم پر نقطے لگائیں تاکہ عجمیوں کے لیے قرآن پڑھنے میں آسانی ہو۔

مصاحفِ عثمانیہ کے اعراب وحرکات

نقطوں کی طرح اعراب وحرکات لگانے کے بارے میں بھی مؤرخین کا اختلاف ہے کہ یہ کام سب سے پہلے کس نے کیا۔ ایک روایت کے مطابق ابوالاسود الدؤلی نے سب سے پہلے والیٔ بصرہ زیاد کی ہدایات پر یہ کام کیا۔ لیکن اس وقت زبر کے لیے حرف کے اوپر ایک نکتہ (ـٚ) اور زیر کے لیے نیچے ایک نکتہ (ـِ)' پیش کے لیے حرف کے سامنے ایک نکتہ (ـ•) اور سکون کے لیے دو نقطے (ـ••) استعمال کیے جاتے تھے۔ بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ اعراب وحرکات کا یہ انداز تبدیل ہوتا گیا۔

مصاحفِ عثمانیہ کے نقطوں اور اعراب کی شرعی حیثیت

شروع میں علماء نے مصاحف کو نقطوں اور اعراب وحرکات سے مزین کرنے کو مکروہ قرار دیا۔ جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"جَرِّدُوا الْقُرْآنَ وَلَا تَخْلِطُوْهُ بِشَیْءٍ"(۱)

"قرآن کو پاک کردو اور اس کو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط نہ کرو"۔

لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مسلمان قرآن کے رسم اور ادائیگی کی حفاظت کے لیے مصاحف پر نقطے اور اعراب وحرکات لگانے پر مجبور ہو گئے' تاکہ اعراب و حرکات اور نقطوں سے خالی ہونے کی وجہ سے لوگ الفاظِ قرآنی کی ادائیگی میں اختلاف کا شکار نہ ہو جائیں اور ہر کوئی اپنی مرضی کے اعراب وحرکات اور نقطے لگاتے ہوئے قرآن کی تلاوت نہ کرنے لگ جائے۔

مصاحف کے رسم الخط اور خط کی تبدیلی

رسم الخط اور خط میں فرق ہے۔ مصاحف کے رسم الخط سے مراد کلمات قرآنیہ کی وہ وضع ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کی کتابت کرواتے وقت پسند کیا تھا۔ جبکہ خط سے مراد لکھنے کا ایک انداز یا سٹائل (style) ہے۔ اس فرق کو ہم درج ذیل مثال سے سمجھتے ہیں:

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں "ملك" کا رسم الخط حذفِ الف کے ساتھ ہے۔ یعنی "مالك" کو بغیر الف کے قرآن مجید میں "ملك" لکھا گیا ہے۔ یہ اس کا رسم الخط ہے۔ اس کو تبدیل کرنا حرام ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مصحف میں "ملك" کو "مالك" لکھتا ہے تو یہ بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن "ملك" کو (بغیر الف کے بھی) مختلف انداز سے لکھا جا سکتا ہے' یعنی اس کو آپ خط نسخ میں لکھیں یا خط نستعلیق میں' دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ رسم الخط وہی رہے۔

اعراب القرآن کی علامات اور نقطوں کی تبدیلی

اعراب القرآن کی علامات بھی مختلف ادوار میں علماء کی طرف سے مختلف مقرر کی جاتی رہی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شروع میں زیر' زبر اور پیش وغیرہ کے لیے نقطے استعمال ہوتے تھے' جبکہ عصر حاضر میں زیر' زبر اور پیش کے لیے ـــِ' ـــَ اور ـــُ کی علامات استعمال کی جاتی ہیں۔

(۱) مناھل العرفان' علامہ عبدالعظیم زرقانی' ج ۱' ص ۴۰۲۔

اسی طرح آپ مشاہدہ کریں گے کہ سعودیہ سے چھپنے والے مصحف میں سکون کی علامت یہ ہے: (ْ) جبکہ پاکستان میں چھپنے والے مصحف میں سکون کی علامت یہ ہے: (ْ)۔

اسی طرح حروف کے نقطوں کی تبدیلی بھی جائز ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں قاف (ق) کے لیے دو نقطے اوپر لگائے جاتے ہیں جبکہ فاء (ف) کے لیے ایک نقطہ اوپر لگایا جاتا ہے' جبکہ بعض ممالک مثلاً مراکش وغیرہ سے چھپنے والے مصحف میں قاف کے لیے (ق) یعنی ایک نکتہ اوپر لگایا جاتا ہے اور فاء کے لیے (ف) یعنی ایک نقطہ نیچے لگایا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اعراب کی علامات ہوں یا نقطوں کی تعداد اور ان کی جگہ' یہ سب تدبیری امور سے متعلق ہیں۔ کسی بھی ریاست کے علماء اعراب اور نقطوں کے لیے کچھ بھی علامات مقرر کر سکتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ حق ریاست کو حاصل ہے نہ کہ کسی فرد کو' ورنہ ہر شخص اپنی مرضی کی علامات بنا لے گا اور قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں عوام الناس کو اور زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قرآن کے اجزاء

مصاحف عثمانیہ میں صرف سورتوں کی تقسیم موجود تھی' جو کہ توقیفی ہے' لیکن مصاحف میں قرآن کو مروّجہ تیس (۳۰) پاروں میں تقسیم نہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح یہ مصاحف اعراب اور نقطوں سے بھی خالی تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے تلاوت میں سہولت و آسانی پیدا کرنے کے لیے قرآن کے مختلف اعتبارات سے حصے کیے۔ بعض نے قرآن کو تیس حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے ہر ایک جزو کو آگے مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ بعض افراد نے مضامین قرآنی کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز میں قرآن کو سہولت و آسانی سے پڑھنے کے لیے قرآن کو ۵۴۰ رکوعات میں تقسیم کیا۔ بعض لوگوں نے قرآن کو احزاب میں تقسیم کیا' یعنی ہر پارہ تقریباً ۸ احزاب پر مشتمل ہے۔ بعض نے ہر پانچ آیات کے بعد ''خمس'' کا نشان متعارف کروایا اور بعض نے ہر دس آیات کے لیے ''عشر'' کی علامت وضع کی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام علماء و مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پارے' رکوعات' اعراب و حرکات' نقاط اور رموزِ اوقاف وغیرہ مصاحف عثمانیہ کے خواص میں سے نہ تھے' بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ علماء نے عوام الناس کی سہولت و آسانی کے پیش نظر ان تقسیمات کو متعارف کروایا۔ ان تقسیمات کے جائز و ناجائز ہونے میں علماء نے بہت تفصیل سے بحثیں کی ہیں جس کا نچوڑ یہی ہے کہ جب تک قرآن میں کسی قسم کے اختلاط' اضافے یا ادخال کا شبہ نہ ہو مصلحت عامہ کے اصول کے تحت ایسے اقدامات کرنا جائز' بلکہ مستحسن ہے۔ oo

کائناتی سائنس اور قرآن

تحریر: سہیل زاہد☆

قوموں کی عالمی برادری میں اُمت مسلمہ کی حیثیت اس اعتبار سے سب سے برتر اور نمایاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ''قرآن مجید'' اس کے حوالے کر کے اس کو ذمہ دار بنایا ہے کہ وہ اس کے پیش کردہ حق کی شہادت اکناف عالم کی تمام اقوام کے سامنے دے' تاکہ وہ اس کتاب سے رہنمائی حاصل کریں' اپنے مالک کو پہچانیں اور اس کے احکام کی روشنی میں اپنے معاملات کی اصلاح کریں۔

یہ لامحدود کائنات' جس میں ہم رہتے ہیں' کس طرح وجود میں آئی؟ یہ تمام توازن' ہم آہنگی اور نظم وضبط کس طرح پیدا ہوئے؟ یہ کیونکر ممکن ہوا کہ یہ زمین ہمارے رہنے کے لیے موزوں ترین اور محفوظ قیام گاہ بن گئی؟ ایسے سوالات نوعِ انسانی کے ظہور ہی سے توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں سائنس دان اور فلسفی اپنی عقل و دانش اور عقلِ سلیم کی بدولت اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کائنات کی صورت گری اور اس میں موجود نظم وضبط کسی اعلیٰ ترین خلاق کی موجودگی کی شہادت دے رہے ہیں' جو اس تمام کائنات کا حاکم و مالک ہے۔

یہ ایک غیر متنازعہ سچائی ہے جس تک ہم اپنی ذہانت استعمال کرتے ہوئے پہنچ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا اعلان اپنی مقدس کتاب ''قرآن پاک'' میں واشگاف الفاظ میں کر دیا ہے' ایک ایسی کتاب میں جس کی سچائی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے' وہ کتاب جو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا اور رہتی دنیا تک کی ہدایت ورہنمائی کے لیے آج سے چودہ سو سال پہلے نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے کائنات کو ایک خاص مقصد کے لیے عدم سے

☆ لیکچرر' قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

وجود بخشا اور یہ کہ کائنات میں موجود سارے نظام اور توازن خاص طور پر انسانی زندگی کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو اسی سچائی پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے:

﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۞ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۞ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۞ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۞﴾ (النّٰزعٰت)

''کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اسے بنایا اور اس کی چھت اونچی اٹھائی' پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد زمین کو اسی نے بچھایا۔''

اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بار ہا یہ ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کو کائنات میں موجود توازن اور نظام پر غور و فکر کرنا چاہیے' جنہیں اس ذات باری تعالیٰ نے اسی (انسان) کے لیے تخلیق فرمایا ہے تاکہ وہ ان کے مشاہدے سے سبق حاصل کرے۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۞﴾ (النحل)

''اسی نے تمہارے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

ایک اور آیت مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۙ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۞﴾ (فاطر)

''وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے۔ چاند اور سورج کو اُس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقرر تک چلا جا رہا ہے۔ وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اُسی کی ہے''۔

یہ سادہ سی حقیقت' جسے قرآن نے بیان فرمایا ہے' اس کی تصدیق جدید فلکیات کی بنیاد رکھنے والے اہم افراد کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے۔ گیلیلیو' جوہانس کیپلر اور آئزک نیوٹن' سبھی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ کائنات کی ساخت' نظامِ شمسی کی صورت گری' قوانین طبیعیات اور ان میں

توازن کی حالتیں' سب کی سب اللہ کی تخلیق کردہ ہیں اور یہ تمام نتائج انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تحقیق سے اخذ کیے تھے۔

اسلام کے اُصولوں کو برسرِحق ثابت کرنے کے لیے ہمیں کسی دوسرے نظامِ فکر کی حمایت وتوثیق حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اسلام کے اصولوں سے کلی اختلاف کرنے والے اپنی تحقیق ومطالعہ کی بنیاد پر کسی بنیادی اسلامی اُصول کی خود ہی تصدیق کر دیں تو تفہیم اور اتمامِ حجت کے لیے اگر انہی کے نتائج فکر وتحقیق کے رجحانات کا حوالہ دے کر یہ بیان کر دیا جائے کہ اسلام نے یہ بات چودہ سو صدیاں قبل واضح طور پر کہہ دی تھی تو یہ بات مخالفین اسلام اور ان کی فکر سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کے لیے اس دین حق کے اصولوں کو سمجھنے میں ممد ومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مغربی تمدن میں جس علم سائنس کو بہت اہم مقام حاصل ہے اسی علم نے کائنات کے آغاز وانجام کے متعلق تحقیقی سطح پر بظاہر جتنی بھی پیش رفت کر لی ہو' لیکن اس کی مہیا کردہ معلومات اور انکشافات میں تشکیک وتذبذب کا عنصر غالب ہے۔ البتہ اس علم کی پیش کردہ تھیوریوں میں پائی جانے والی ساری کمزوریوں کے باوجود' اس سلسلے میں کی جانے والی تحقیقی اور مشاہداتی کاوشوں کی وسعت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض باتیں تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر درست بھی ثابت کی جا سکتی ہیں۔ لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ فلکیاتی سائنس نے مشاہدات وتحقیق کے ذرائع سے' چاہے وہ جس قدر بھی کمزور ہوں' اس رجحان کو تقویت پہنچائی ہے کہ یہ عالم کسی نہ کسی مرحلے پر کسی نہ کسی وجہ سے خاتمے سے ہمکنار ہو جائے گا' یہ نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ یہ اور بات ہے کہ مغربی تمدن خداناشناسی اور مادہ پرستی پر اصرار کی وجہ سے اپنی تمام اضطرابی اور تشکیکی کیفیات کے باوجود' یقین محکم کے حصول کے لیے' اللہ تعالیٰ کے وجود کو خالق و مدبر کائنات کی حیثیت سے اور وحی کے اصول کو ذریعہ ہدایت کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں۔

جو بات قرآن نے چودہ صدیاں قبل کہہ دی تھی کیا کائنات کے انجام کے متعلق رواں صدی میں ظاہر ہونے والے سائنسی رجحانات اس سے مطابقت اختیار نہیں کر رہے؟ البتہ قرآن کا مقصد تکنیکی اور سائنسی مسائل پر روشنی ڈالنا نہیں ہے۔ وہ تو اس عالم کے اختتام کی کیفیت کو اس نقطۂ نظر سے بیان کرتا ہے کہ بالآخر اس میں کیے گئے اعمال کی باشعور و بااختیار انسان کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ اس کے لیے اس عالم کی موجودہ صورت کو ختم کیا جائے گا اور

ایک دوسری ہی طرز کے احوال وظروف رکھنے والے عالم کو وجود میں لایا جائے گا' جس میں اسے جزاء وسزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اس دنیا کے زیروزبر ہونے کی کیفیت پر قرآن نے اتنی روشنی ڈالی ہے جس سے اس وقت رونما ہونے والی صورت حال کا نقشہ انسانی ذہن میں آ جائے۔ اس دور میں اس کیفیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ سورج' چاند' ستارے' زمین اور سمندروں کی حالت کا جس انداز سے قرآنی آیات میں تذکرہ ہے وہ الفاظ اصطلاحات اور تعلیمی نظریات کے اختلاف کے ساتھ آج کے علم فلکیات وکائنات سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں موضوع بحث وگفتگو بنے ہوئے ہیں۔ قرآن ایسی تکنیکی بحثیں کرتا ہے نہ ان سے منع کرتا ہے۔ مسلمان بھی اپنے دورِعروج میں علم فلکیات میں دلچسپی لیتے رہے اور تجربات اور مشاہدات میں مصروف رہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے مسلمانوں کے مہیا کردہ علمی مواد سے فائدہ اٹھا کر مغرب میں اس شعبۂ علم میں خاصی ترقی کی گئی ہے' لیکن کبھی کوئی بات قرآن کے کسی بیان کے خلاف ثابت نہیں ہوئی۔

انعقادِ قیامت وعالم آخرت کا موضوع چونکہ اسلام میں اساسی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر صرف زبانی نہیں بلکہ محکم ایمان لانے پر اس دنیا میں انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی روش کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھال سکتا ہے اور جواب دہی کے احساس کے تحت ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرسکتا ہے' لہٰذا اس نے کائناتی مسئلے پر کسی قدر تفصیل سے اجمالی نکات کی شکل میں گفتگو کی ہے۔ سینکڑوں ایسے سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں اور اٹھائے جارہے ہیں۔ سائنس دان ان کا ایک ہی جواب دیتے ہیں اور مادہ پرست فلسفی بھی ان کی ہمنوائی کرتے ہیں کہ سب کچھ اتفاقات اور حادثات ہی کا مرہونِ منت ہے۔ کائنات جس راستے پر جارہی ہے ازخود ہی کسی غایت کے بغیر جارہی ہے۔ لیکن ایسے اصحابِ فکر کی بھی کمی نہیں جو اس معاملے میں سخت اضطراب محسوس کررہے ہیں۔ یہ لوگ جہاں ایک طرف یہ اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا کارخانۂ قدرت کسی کارساز ہستی کے بغیر خود کیسے چل سکتا ہے تو دوسری طرف وہ مادہ پرستی کی جکڑبندیوں میں اس حد تک گرفتار ہیں کہ اس خول سے نکل کر وہ اس معمے کو حل کرنے کے لیے کسی متبادل ذریعۂ ہدایت سے رجوع کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے۔ قرآن نے ان انسانی کمزوریوں پر بہت روشنی ڈالی ہے اور اس کے لیے تاریخی حوالے اور جماعت انبیاء علیہم السلام کو اپنی دعوت کے سلسلے میں پیش آنے والی ان مشکلات اور رکاوٹوں کے تذکرے کیے ہیں جو آباء پرستی اور لکیر کا فقیر بننے سے

متعلق ہیں۔ مغرب اس کمزوری سے مستثنیٰ نہیں' لہٰذا اپنی روشن خیالی اور آزادیٔ فکر کے تمام دعاوی کے علی الرغم مادہ پرستانہ فکر کی حدود سے باہر جھانکنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس دائرے میں محدود رہ کر ان مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتا ہے جن پر فکر کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اساس موجود نہیں۔

سب سے بڑا اور نمایاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنی اس قدر عظیم صلاحیتوں کے باوجود اس کائنات کے متعلق جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے' کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تو وہ عالم غیب یا حقیقت کے متعلق جس کا اس کی دسترس سے باہر ہونا امر بدیہی ہے' اپنی ذہنی کاوشوں سے کس طرح معلومات حاصل کر سکتا ہے؟ اس سوال کا حقیقت پسندی کے ساتھ سامنا نہ کرنے کی وجہ سے کائنات اور دوسرے بہت سے معاملات میں انسانی کاوشوں کا ضیاع ہو رہا ہے' جو دوسرے مفید مقاصد کے حصول کے لیے صرف کی جا سکتی ہیں۔ اس کائنات میں جاری و ساری بعض قواعد و ضوابط ایسے ہیں جن کو انسان اپنے مشاہدات اور تجربات کے ذریعے سے دریافت کر سکتا ہے' لیکن ان کا انجام بقول جے ڈبلیو این سلی وان اس کائنات کے ڈھانچے سے ہے نہ کہ اس کی حقیقت سے۔ کائنات کے آغاز و انجام کا تعلق ادراکِ حقیقت سے ہے اور ادراکِ حقیقت ہماری توانائیوں کی پہنچ سے ماوراء ہے۔ اس لیے مغرب کے مادہ پرستوں نے مادہ سے بالا کسی حقیقت کے وجود سے انکار کرنے اور مسلک لاادریت (Agnosticism) کی اوٹ میں پناہ لینے ہی میں عافیت محسوس کی۔

انسانی فکر و نظر کی مادی تاریخ شاہد ہے کہ حکماء و مفکرین ہمیشہ ہی تلاشِ ''حقیقت'' کے لیے سرگرداں رہے ہیں۔ البتہ دورِ حاضر کے مغرب میں بعض ایسے کوتاہ بین مدعیان علم نظر آتے ہیں جو محسوسات سے آگے کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں' اگرچہ وہ محسوسات کی ماہیت کا بھی کھوج نہیں لگا سکے۔ عملیت (Pragmatisim) اور تجربیت (Empiricism) کے نظریات کی بہت دھوم ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادراکِ حقیقت کے معاملے میں ان کی افادیت صفر کے برابر ہے' اور مغربی فکر کے تمام شعبے لاادریانہ اور تشکیک کی بیماری میں مبتلا ہیں' کوئی مسلک نہیں جو بے یقینی کی زد سے بچا ہو۔ ظن و تخمین کی بنیاد پر فکر و نظر کی عمارتیں کھڑی کرنے والوں کے متعلق قرآن کہتا ہے:

﴿اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا﴾ (النجم)

''وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسانی سمیت تخلیق وانجام سے لے کر اخلاقی اور ہر قسم کی دوسری قدروں تک ہر معاملہ بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ انسانی شرف ومجد کا تصور پامال ہو چکا ہے اور اس کے مقابلے میں زُخرفاتِ دنیا تمام تر توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اس صورتِ حال نے جس اندازِ فکر وعمل کو جنم دیا اس سے ﴿تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۴۰) کے قرآنی اصول کے مطابق دوسروں کے مقابلے میں تکنیکی ترقی کے ذریعے سے غلبہ حاصل کر کے مغرب نے دنیا کو ظلم وتعدی اور فساد سے بھر دیا۔

کائناتی حقیقتوں کے متعلق ہزاروں سال پر پھیلے غور وفکر اور تحقیق ومشاہدات کے باوجود انسان جو معلومات حاصل کر سکا ہے اور خصوصاً دورِ حاضر کی سائنس اپنی نمایاں خصوصیات اور آلات کے ذریعے سے' بلکہ خلا میں پہنچ کر وسیع پیمانے پر کیے جانے والے مشاہدات کی بنا پر جو انکشافات کر سکی ہے ان کے متعلق ہم نے سائنس کے حلقے سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی تحریروں سے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ موجودہ سائنس تمام تر جدید وسائل کے باوجود کائنات کے آغاز وانجام کے متعلق نہ صرف یہ کہ کوئی قابل اعتماد معلومات حاصل نہیں کر سکی' بلکہ اس نے ذہنوں میں الجھاؤ پیدا کر دیے ہیں۔ مزید برآں بہت سے محققین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ باتیں انسانی ذہن کی رسائی سے ماوراء ہیں اور رہیں گی۔ اس کے بعد یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کا آغاز وانجام اور اس کی حقیقت معاملات غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان زمان ومکان اور دوسری محدودیتوں میں مقید ہے' لہٰذا اس کے لیے عالم غیب سے تعلق رکھنے والے معاملات کا علم حاصل کرنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔

قرآن غیب کے متعلق کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کسی کو علم نہیں:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ؕ﴾ (الانعام:۵۹)

''اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں' اُس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔''

پھر دوٹوک الفاظ میں فرما دیا کہ اس کائنات کے خاتمے اور قیامِ قیامت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ﴾ (الاعراف:۱۸۷)

''(اے نبیؐ!) لوگ آپ سے قیامت (کے وقت) کے متعلق پوچھتے ہیں' کہہ دیجیے اس کا علم تو بس میرے پروردگار ہی کے پاس ہے''۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تبدیلی ایک زوردار دھماکے کے نتیجے میں واقع ہوگی۔ چونکہ اس کی کیفیت کا تصور کرنا ہمارے بس سے باہر ہے' اس لیے اس پہلو سے ہم اس پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے۔ قرآن میں اس واقعے کے ظہور میں آنے کے ذریعے کے لیے ''صَیْحَة'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ معنوی اختلاف کے بغیر مختلف مفسرین نے اس لفظ کا ترجمہ اپنی صوابدید کے مطابق کیا ہے۔ صاحب ''تدبر قرآن'' نے اس کا ترجمہ ''ڈانٹ'' کیا ہے۔ مولانا محمود حسن نے ''چنگھاڑ'' مارماڈیوک پکتھال نے ''shout'' یعنی ''چیخ'' اور عبداللہ یوسف علی نے ''blast'' یعنی ''زوردار جھونکا'' کے الفاظ سے کیا ہے۔ مطلب ایک ہی ہے' یعنی یہ کائنات ایک ہیجان انگیز کیفیت کے ظہور کے ساتھ ختم ہوگی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُھُمْ وَھُمْ یَخِصِّمُوْنَ ۝﴾ (یٰسٓ)

''اور یہ کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ پورا اگر تم سچے ہو؟ تو یہ راہ دیکھتے ہیں ایک چنگھاڑ کی جو ان کو آ پکڑے گی جب وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔''

کائناتی سائنس دان اپنے پیش کردہ نظریات میں نظم پیدا کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ کائنات کے آغاز و انجام میں واقعاتی تسلسل اور ربط پیدا کریں' چاہے اس سلسلے میں انہیں کئی باتیں اٹکل اور بے بنیاد اندازوں سے اختراع کرنی پڑیں' جیسے ارتقاء کی تھیوری کے معاملے میں کیا جاتا ہے۔ گفتگو کو ''بڑے دھماکے'' (Big Bang) سے شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قبل کیا تھا' ہمیں معلوم نہیں اور نہ شاید ہو سکے۔ دراصل انہیں اس ابتدائی دھماکے کے متعلق بھی براہِ راست کچھ معلوم نہیں۔

قرآن سائنس دانوں کے تمام فکری الجھاؤ کو دُور کر دیتا ہے' بشرطیکہ اُس قادرِ مطلق ہستی کو تسلیم کیا جائے۔ وحی' رسالت' قرآن' حدیث' سنت اور توحید کے تذکرے میں ایسے دلائل مل جاتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ کائنات کے متعلق سب سے پہلا جو سوال اٹھایا جاتا ہے وہ اس کے آغاز سے متعلق ہے اور وہ بھی عدم سے وجود میں لانے کے مفہوم میں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

﴿اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ؕ بَلٰی ۙ وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝﴾ (یٰسٓ)

''کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے' وہ ان جیسوں کو بنانے پر قادر نہیں ہے؟ کیوں نہیں؟ وہی تو ہے اصل بنانے والا' سب کچھ جاننے والا۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔''

ایک وقت تھا جبکہ اس کائنات کا وجود نہیں تھا۔ یہ بات سائنس بھی تسلیم کرتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ از خود وجود میں آ گئی' لیکن قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لایا۔ وہ اللہ جو اس بات پر قادر ہے کہ جب وہ کسی چیز کو بنانا چاہے تو اس کے ارادے کی تکمیل کے لیے اس کا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ''ہو جا'' اور وہ وجود میں آ جاتی ہے' تو ظاہر ہے کہ جب کائنات کی ابتداء و تخلیق بھی اُسی نے کی اور اُسی کی تدبیر کے تحت یہ رواں دواں ہے تو کسی انجام سے دوچار کرنا بھی اُسی کے اختیار میں ہوگا' پھر اتنے عظیم عالم موجودات کو پیدا بھی کیا اور اس کو ایک نظم کے تحت چلا بھی رہا ہے' لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ اس کی کوئی غایت اور کوئی مقصد نہ ہو۔ چنانچہ واضح کر دیا گیا کہ:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴾ (الانبیاء)

''ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔''

تخلیقِ آدم اور اسے اس دنیا میں بسانے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے ہدایت کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا' تا کہ انسان اس کی تعلیمات کے مطابق اس ارضی زندگی کو منظم کرے' وہ انبیاء و رُسل کے ذریعے سے پورا کیا جاتا رہا ہے' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر ایک ایسا مکمل دین نازل کیا جو انسانی فکر و عمل کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور جس کی تعلیمات کی تا ابد حفاظت کا اُس نے خود ذمہ لیا ہے۔ یہی دین فطرت ہے اور صرف یہی انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں عالم انسانیت فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کے اُصولوں کو اپنانے یا نہ اپنانے کو اُخروی زندگی میں کامیابی کے لیے معیار بنایا جائے گا۔ ○○

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

فضیلت صیام وقیامِ رمضان

بزبانِ صاحب قرآن ﷺ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ، وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے' اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لئے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیئے گئے' اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لئے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!''